حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ

دوامِ حدیث

قرآن و حدیث دونوں یقینی ہیں

جب یقین اور ظن کا معنی واضح ہوگیا اور یہ بھی واضح ہوگیا (کہ کسی کے متعلق یہ کہنا کہ یقینی ہے) اس کے تین معنی ہوتے ہیں:

۱۔ اس کا ثبوت یقینی ہے کیونکہ متواتر ہے یا اس پر اجماع ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی۔

۲۔ اس کا مفہوم یقینی طور پر یہی ہے کیونکہ یہ محکم ہے یا مفسر ہے صرف نص یا ظاہر یا مؤول یا خفی یا مجمل یا مشکل یا متشابہ نہیں۔

۳۔ اس کا مضمون یقینی ہے کیونکہ بدیہی ہے یا اس پر برہان موجود ہے۔

تو اب اس دعویٰ (کہ دین یقینی ہونا چاہیے، ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی) کو سمجھنا آسان ہوگیا کیوں کہ اس جگہ یقینی سے مراد اگر یہ ہو کہ اس کا ثبوت یقینی ہونا چاہیے تو پھر مندرجہ ذیل باتوں میں غور کرنا چاہیے:

۱۔ قرآن مجید کی تبلیغ کرنے کا حق ایک آدمی کو نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس قدر آدمی ہونے چاہییں جن سے تواتر متحقق ہو جاتے کیونکہ تواتر کے بغیر جو خبر ہوگی وہ ظنی ہوگی۔ اور ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی۔

۲۔ کسی اخبار یا پرچے میں ایک آدمی کے مضمون کو دین سمجھ کر شائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک آدمی کی خبر ظنی ہوتی ہے اور ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی بلکہ اس قدر آدمی ہونے چاہییں جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔

۳۔ پھر تبلیغ میں ایک آدمی کا ترجمہ معتبر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک کی بات ظنی ہوتی ہے اور ظنی امر دین نہیں ہو سکتا۔

۴۔ پھر لغت میں ایک آدمی کی شہادت قبول نہیں ہونی چاہیے جب عموماً اہل لغت ایک ایک آدمی کی شہادت لے لیتے ہیں کیونکہ یہ چیز ظنی ہوگی اور ظنی چیز دین نہیں ہوتی۔

۵۔ اگر حدیثیں اس لیے دین نہیں کہ ظنی ہیں تو جو حدیثیں یقینی ہیں ان کو دین ماننا چاہیے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل قسم کی حدیثیں یقینی ہیں۔

۱۔ جو لفظاً متواتر ہیں کیونکہ متواتر میں عدد معین کی شرط صحیح نہیں بلکہ جس عدد سے علم حاصل ہو وہ تواتر کے لیے کافی ہے اور راویوں کے عالی صفات گنتی کے قائم مقام ہو جاتے ہیں بلکہ بہت سی صفات گنتی سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:

"میں نے علوم الحدیث اور شرح نخبۃ الفکر میں اس شخص کا رد کیا ہے جو کہتا ہے کہ متواتر کی مثال صرف حدیث (مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا الخ) یعنی جو مجھ پر عمداً جھوٹ بولے اور میں نے بیان کیا ہے کہ متواتر کی مثالیں بہت ہیں:

(۱) من بنی للہ مسجدا الخ (جو اللہ کے لیے مسجد بنائے (ب) موزے پر مسح کرنے کی حدیث (ج) رفع یدین کی حدیث (د) شفاعت کی حدیث (ہ) حوض کی حدیث (و) آخرت میں اللہ کے دیدار کی حدیث (ز) اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (امام قریش سے ہوں گے[1]"

۲۔ وہ حدیثیں جو معنیً متواتر ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے فرمایا ہے کہ:

"طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، خرید و فروخت، نکاح اور غزوات کے احکام میں بہت سی حدیثیں معنیً متواتر ہیں[2]"

۳۔ وہ حدیثیں جن پر امت کا اجماع ہے اور اس قسم کی حدیثیں بے شمار ہیں۔

۴۔ وہ حدیثیں جن کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے جیسے بخاری مسلم کی وہ حدیثیں جن پر بعد میں کسی محدث نے تنقید نہیں کی۔

ان چار قسم کی حدیثوں کو بسبب یقینی ہونے کے دین سمجھنا چاہیے۔

اگر دین کے یقینی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ:

★ دین وہ کلام ہوگا جس کا مدلول یقینی ہو تو اس صورت میں قرآن و حدیث دونوں برابر ہیں۔

---

[1] فتح الباری، ج ۲، ص ۱۰۴ [2] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۱، ص ۱۰۴

★ اگر حدیث کے بعض کلمات کی دلالت ظنی ہے تو اس طرح قرآن کے بعض کلمات کی دلالت بھی ظنی ہے
★ اگر قرآن کے بعض کلمات کی دلالت یقینی ہے تو حدیث کے بعض کلمات کی دلالت بھی یقینی ہے۔
چنانچہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر دین کے یقینی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ:

★ اس کا مضمون یقینی ہے تو اس مسئلہ میں قرآن و حدیث دونوں برابر ہیں متکلمین دونوں کو یقینی کہتے ہیں اور منطقی کسی کو بھی یقینی نہیں کہتے نہ قرآن کو اور نہ حدیث کو بلکہ دونوں کو مقبولات میں داخل کرتے ہیں اور مقبولات ظنی ہوتی ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

کسی امر کا دین ہونا اس امر کے منافی نہیں کہ وہ تاریخ بھی ہو۔

★ قرآن مجید باوجود اس کے کہ دین ہے تاریخ پر بھی مشتمل ہے۔ اس طرح احادیث دین بھی ہیں اور دین کی ابتدائی تاریخ بھی ہے جیسے قرآن مجید میں دین پر عمل کرنے والوں اور منکروں کا مفصل بیان ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا ذکر ہے۔ جیسے قرآن میں احکام ہیں ایسے احادیث میں بھی احکام ہیں۔

اگرچہ دین کے یقینی اور ظنی ہونے کی بحث ایک حد تک مکمل ہو چکی ہے مگر پھر بھی ناظرین کی تسلی کے لیے ان دلائل کی حقیقت بھی کھول کر بیان کرنا ضروری ہے جو بعض منکرین حدیث نے بیان کیے ہیں۔

دین کے یقینی ہونے کے دلائل

(۱) وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّاؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔاؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ [1] ترجمہ: اور ان میں سے اکثر ظن ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

کسی خبر کے متعلق یہ کہنا کہ یہ یقینی ہے اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں:

- اس کا ثبوت یقینی ہے۔
- اس کی دلالت یقینی ہے۔

---

[1] سورہ یونس

ہ- اس کا مضمون یقینی ہے (واقعہ کے اعتبار سے)

اس آیت میں حق اور ظن کا اطلاق تیسرے معنے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی شرک حق نہیں بلکہ ظنی چیز ہے۔ واقعہ کے خلاف ہے اور ظن کا اطلاق چونکہ یہاں حق کے مقابلہ میں ہے اس لیے اس مقام پر ظن کا معنی جھوٹ اور باطل کا ہے اور حق کا معنی واقعہ کے موافق ہونے کا ہے۔

فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ ظن بہت جھوٹی بات ہے۔

حق اور صدق کا معنی ایک ہی ہے یعنی سچی اور پکی بات اور ظن کے معنے ہوئے جھوٹی اور کچی بات۔ اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مشرک اپنے دین میں کسی حجت اور دلیل کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اپنے آباء و اجداد کے پیچھے بلے سوچے سمجھے جا رہے ہیں۔

زمخشری نے یہ معنیٰ ہے کہ اللہ پر جو ایمان کا دعوے کرتے ہیں وہ علم کے درجے کا نہیں بلکہ ظن کے درجہ میں ہے۔ اعتقادات میں دلائل قطعیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور باقی عملی احکام میں دلائل ظنیہ (منطقی معنے کے اعتبار) سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اس صورت میں ظن سے منطقی معنیٰ مراد لینا پڑے گا۔ مگر ظن کی مذمت کا تعلق محل خاص کی وجہ سے ہوگا یعنی اعتقادی امور میں یقین کی ضرورت ہے ظن کافی نہیں اور قرائن وہ اولہ ہوں گے جو ظنی دلائل کے واجب العمل ہونے پر دلالت کرتے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ صحیح بات یہ ہے کہ اس آیت میں صرف اس امر کا ذکر ہے کہ دین میں پکی اور سچی بات ہونی چاہیے اور پکی اور سچی ہونے کے مراتب ہوتے ہیں۔

اعتقادات میں اعلیٰ درجہ درکار ہے اور عملیات میں ادنیٰ درجہ بھی کافی ہے اور دونوں مرتبوں کو ظن مذموم نہیں کہہ سکتے بلکہ ظن مذموم شک وہم، جھوٹ کے معنے میں ہے۔ منطقی معنے کے ساتھ کسی شیٔ کا ظنی ہونا اس کے حق ہونے کے منافی نہیں۔ ہاں اعتقادات میں چونکہ قطعی دلائل درکار ہوتے ہیں اس لیے وہاں (معنیٰ منطقی) ظنی دلیل کا استعمال بھی قابل مذمت ہے۔

یہ تقریر ان متکلمین کے مذہب پر ہے جن کے نزدیک دلائل نقلیہ سے بھی یقین حاصل ہو سکتا ہے یعنی جب دلائل نقلیہ ثبوت و دلالت اور مضمون کے اعتبار سے یقینی ہوں تو ان سے عقیدہ کا اثبات ہو سکتا ہے خواہ وہ دلائل قرآن میں ہوں یا احادیث میں کیونکہ بہت سی احادیث بھی ثبوت و دلالت اور مضمون کی حیثیت کے اعتبار سے یقینی ہیں اور جو دلائل بلحاظ ثبوت یا دلالت یا مضمون کی صداقت کے اعتبار سے یقینی نہ ہوں تو

ان سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا مگر ان پر عمل کرنا واجب ہے اور اس قسم کے دلائل قرآن و حدیث دونوں میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید اگرچہ مضمون کی حقیقت کے اعتبار سے یقینی ہے جیسے وہ احادیث جن کا ہم نے ذکر کیا ہے مگر دلالت کے اعتبار سے سارا قرآن یقینی نہیں بلکہ بعض احادیث کی طرح ظنی ہے۔ ہاں ثبوت کے لحاظ سے سارا قرآن اور احادیث کا اکثر حصہ بھی یقینی ہے مگر قرآن اگر خبرِ واحد کے ذریعہ کسی کو پہنچے تو اس وقت اس کا ثبوت ظنی ہو گا ظنی چیز پر عمل واجب ہوتا ہے مگر جو متکلمین یہ کہتے ہیں کہ ادلہ نقلیہ سے یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظن ہی حاصل ہوتا ہے۔ معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کا یہی مسلک ہے ان کے قول کے مطابق یقین سے مراد تصدیق کا وہی مرتبہ مراد لینا پڑے گا جو ادلہ نقلیہ سے حاصل ہوتا ہے اور ظن اس سے کم مرتبہ (جو شک، وہم اور جھوٹ کی صورت میں ہوتا ہے) مراد لینا پڑے گا۔ اس معنی کے اعتبار سے سب احادیث صحیحہ یقینی ہوں گی نہ ظنی۔

معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کے نزدیک ان عقائد میں جن پر شریعت موقوف ہے دلائل عقلیہ سے کام لیا جاتا ہے۔ دلائل نقلیہ وہاں کارآمد نہیں۔ پس اس صورت میں آیت مذکورہ میں عقائد کے معاملہ میں دلائلِ عقلیہ مراد ہوں گے یعنی مشرکین کے پاس کوئی ٹھوس عقلی دلیل نہیں بلکہ کچی باتیں ہیں جن کو خرص و تخمین و ظن اور جھوٹ کہا جاتا ہے اگر کوئی ٹھوس دلیل علم کی بات ہو تو پیش کریں۔

بہر کیف آیت میں حق سے مراد مضمون کا نفس الامر کے مطابق ہونا اور ظن سے مراد نفس الامر کے خلاف ہونا ہے۔

احادیث اور قرآن کے بارے میں جو یقینی اور ظنی ہونے کی بحث ہو رہی ہے وہ ثبوت کے اعتبار سے ہے نہ مضمون کے نفس الامر کے موافق یا مخالف ہونے کے بارے میں کیونکہ اس بحث (مضمون کی صداقت وعدم صداقت) کا تعلق اس بات سے ہے کہ دینی حدیثیں بھی بذریعہ وحی آتی ہیں یا نہیں۔ اگر بذریعہ وحی نہیں آتی تو جب اللہ کی طرف سے ان کی تردید نہیں ہوئی تو کیا حکمِ وحی ہے یا نہیں۔ حدیثوں کو ماننے والے تو اکثر دینی احادیث کو بذریعہ وحی مانتے ہیں اور جو حدیثیں اجتہادی ہیں بوجہ عدم تردید ان کو وحی کے حکم میں مانتے ہیں۔ پس اس صورت میں مضمون کی صداقت کے اعتبار سے قرآن اور دینی حدیثوں کا مرتبہ برابر ہے اور یہ بحث دلالت کے اعتبار سے بھی نہیں کیونکہ اس اعتبار سے بھی قرآن و حدیث ظنیت اور یقین میں برابر ہیں اور اس آیت مذکورہ کا تعلق ثبوت کے بارے میں نہیں۔ پس اس آیت کا پیش کرنا بے محل ہوا۔

★ اس امر پر کہ دین یقینی ہوتا ہے نہ ظنی دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ (جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کی ہے وہ بالکل حق ہے۔

اس آیت میں بھی مضمون کی صداقت زیر بحث ہے بلکہ کتاب کا من جانب اللہ ہونا مراد ہے۔ نہ ثبوت وعدم ثبوت یا ثبوت کے اعتبار سے ظن ویقین ہونا۔ اور مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ قرآن باعتبار ثبوت کے یقینی ہے۔ اور آیت میں اس کا ذکر نہیں لہذا یہ آیت موضوع بحث سے غیر متعلق ہوگی۔

★ تیسری دلیل یہ ذکر کرتے ہیں:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (اس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ سراسر حق ہے یعنی یقینی ہے ظنی وقیاسی نہیں الخ۔

اس آیت کا تعلق بھی مضمون کے نفس الامر کے مطابق ہونے کے ساتھ ہے نہ ثبوت کے اعتبار سے اور بحث ثبوت کے متعلق تھی اور مضمون کے اعتبار سے قرآن اور دینی حدیثیں دونوں برابر ہیں یعنی یقینی ہیں یا ظنی ہیں۔

پھر اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اس میں شبہ نہیں کہ قرآن خود کہتا ہے کہ:

اِنَّھُمْ لَفِیْ شَکٍّ مُّرِیْبٍ یقیناً وہ سخت شک میں ہیں۔

اگر آیت کا یہ مطلب ہو کہ قرآن میں کسی کو شبہ نہیں تو اس صورت میں لازم آتا ہے کہ کافر وہی ہوگا جو معاند ہو یعنی دل سے مانتا ہو مگر زبان سے انکار کرتا ہو حالانکہ قرآن جابجا یہ کہتا ہے کہ کافر شک میں ہیں۔

بَلْ ھُمْ فِیْ رَیْبِھِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ یہ لوگ اپنے شک میں پھر رہے ہیں۔

ہاں آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کی صداقت پر ایسے دلائل موجود ہیں کہ اگر کوئی شخص صحیح طور پر ضد وہٹ دھرمی کو چھوڑ دے تو اس کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر یقین ہو جاتا ہے۔ پس گویا کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ معنے اس امر کے منافی نہیں کہ کسی کو اس میں شک ہو۔

● یہ دلائل تھے قرآن کے یقینی ہونے کے۔ اب اس کے بعد جو منکرین حدیث نے قرآن کے محفوظ ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ بھی سنیے چنانچہ لکھتے ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا

ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)

اس آیت میں حفاظت کا مطلب نہیں بتایا گیا کہ حفاظت سے مراد نزول کے وقت کی حفاظت ہے یا نزول کے بعد کی حفاظت۔ ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب ہو کہ نزول کا عام کام ہماری حفاظت میں ہوتا ہے آگے پیچھے پہرے لگا دیے جاتے ہیں تاکہ خدا کا کلام پورا پورا محفوظ پہنچ جائے۔ اگر یہ معنے مراد ہوں تو اس سے بعد کی حفاظت معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ نزول کے وقت کی حفاظت تو تمام سماوی کتب کے بارے میں ہوتی ہے۔

اگر نزول کے بعد کی حفاظت مراد ہو یعنی قرآن کو رد و بدل سے ہم محفوظ رکھیں گے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حفاظت دائمی ہو کیونکہ اس قسم کا لفظ ہر جان کے متعلق وارد ہے:

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ (ہر جان پر نگہبان ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک جان کا محافظ ہے۔

مگر باوجود اس کے جانوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں کبھی کوئی شخص بیمار ہوتا ہے۔ کبھی جوان، کبھی بوڑھا پھر موت کے پنجے کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم قرآن مجید کو ہمیشہ کے لیے محفوظ مانتے ہیں کیونکہ ہم قرآن کا ترجمہ روایات سے کرتے ہیں۔ اور روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے گا مگر منکرین حدیث جو قرآن کو صرف قواعد اور لغت سے سمجھنے کے دعویدار ہیں۔ وہ قرآن مجید کی دائمی حفاظت کس طرح ثابت کریں گے۔

پھر قرآن کے الفاظ کی حفاظت کرنا اور اس کے معانی کی حفاظت نہ کرنا یہ کامل حفاظت نہیں ہے بلکہ کامل حفاظت یہ ہے کہ جیسے قرآن کے الفاظ محفوظ ہیں اسی طرح اس کے معانی بھی محفوظ ہوں۔ اور وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ان احادیث کی بھی حفاظت کی جائے جن کا دین سے تعلق ہے۔

پس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ قرآن کے الفاظ اور اس کے بیان (حدیث) کی حفاظت کریں گے۔

اسی بنا پر ابن حزمؒ نے دعوے کیا ہے کہ جو حدیث محدثین کے طریق پر صحیح ہو اور ہم کو باوجود تفتیش کثیر کے کسی قسم کا ضعف اس میں معلوم نہ ہو سکا تو ایسی حدیث قطعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس کے ضمن میں ان احادیث کی حفاظت کا وعدہ ہے جو قرآن کا بیان ہیں (اور حقیقت میں تمام دینی حدیثیں جن کی سن جانب اللہ تردید نہیں ہوئی قرآن ہی کا